
مسیحیت کا
تصوّرِ زمان و مکاں
یونانی صحائفِ مُقدّسہ اور مُروّجہ علوم کی روشنی میں

مسیحی مذہب کی جڑیں یہودی مذہب سے جا کر ملتی ہیں۔ یسوع مسیح یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں موسیٰ کی شریعت کو منسوخ کرنے نہیں آیا۔ ناصرة کے عبادت خانے میں اپنے مواعظ کے دوران وہ یہودیوں کو انبیائے سابق کی بشارتیں یاد دلاتے تھے۔ اُن کا پیغام بہت سادہ تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کائنات کا مالک ہے اور اُس کی بادشاہی جلد آنے والی ہے۔ میں اُسی کی خوشخبری دینے آیا ہوں۔



یہ وہ زمانہ تھا، جب مغربی ایشیاء کی قومیں رومی سلطنت کے جبر و تشدّد سے نالاں تھیں۔ اِس پیغام نے پسے ہوئے انسانی طبقوں میں اچھے دِنوں کی اُمّید پیدا کر دی۔ لٰہذا عام خیال یہ پیدا ہوا کہ یسوع وہی "مسیحا" ہے، جس کی بشارت یہودی نبیوں نے دی تھی۔ لیکن دوسری طرف رومی حاکموں اور یہودی امراء نے یسوع کو ایک "باغی" اور "انقلابی" قرار دے کر ردّ کر دیا۔ بقول جے ڈی برنال "یسوع کا وہی حشر ہوا، جو باغیوں اور انقلابیوں کا ہوتا ہے"۔



جب خدا کی بادشاہی قائم نہ ہوئی اور یسوع کو مصلوب کر دیا گیا
تو اُن کے پیروکاروں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن انہوں نے اپنے
دلوں میں یہ خیال مضبوط کیا کہ یہ ظلم کا نظام جلد ختم ہو گا۔ کیونکہ
یسوع مسیح نے واپسی (دوبارہ آمد) کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اُس زمانے
کے مسیحی کسی دوسری دنیا کی بابت نہیں سوچتے تھے، بلکہ اِسی دنیا
میں یسوع کی دوبارہ آمد کے بعد اِس کے نظام کی درستگی کے منتظر
تھے۔



لیکن رفتہ رفتہ جب امیر لوگ بھی مسیحی مذہب کو قبول کرنے لگے تو عقائد میں نَو افلاطونی نظریات داخل ہو گئے۔ نَو افلاطونیت کے مطابق "مذہب دوسری دنیا کی چیز ہے"۔ لہٰذا مسیحی عقیدہ میں یہ خیال بھی شامل ہو گیا کہ یسوع کی دوبارہ آمد پر یہ دنیا ختم ہو جائے گی، آخری انصاف ہو گا اور ایک ایسا نظام قائم کیا جائے گا، جس کا وعدہ توراۃ اور صحائفِ انبیاء میں کِیا گیا ہے۔ یہیں سے "عاقبت کی زندگی" کا تصوّر مسیحی عقائد میں داخل ہوا۔



اِس طرح مسیحی مذہب نے کوئی نیا فلسفہ پیش نہیں کِیا۔ کچھ عرصہ یہودیت سے ناتا توڑنے اور مسیحیت کو ایک "نیا مذہب" ثابت کرنے کی کوشش بھی ہوتی رہی، لیکن بالآخر یہودی صحائف کو مسیحی صحائف کے ساتھ ملا کر اُن کی اتھارٹی کو تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ یہودیوں کے نزدیک صرف عبرانی صحائف ہی معتبر رہے، لیکن مسیحیوں نے یہودی صحائف کو بھی مسیحی صحائف کی بنیاد کے طور پر سمجھا اور مسیحی اِلٰہیات میں مُقدّمے کی حیثیت دی۔



مسیحی صحائف کا دعویٰ ہے کہ خدا کو نوعِ انسانی سے پیار تھا اور
اِسی وجہ سے خدا نے اپنے بیٹے یسوع کو بھیج کر اُن کی نجات کا
انتظام کیا۔ یسوع نے اِس نجات کے منصوبے میں اپنی جان
صلیب پر قربان کی اور مر کر دوبارہ زندہ ہوا۔ اِس عمل کو
"کفّارہ" کہا جاتا ہے اور اِس سے خدا اور انسان کے درمیان
"جُدائی کی دیوار" گِرا دی گئی اور یوں بنی نوع انسان کے لئے
نجات کو ممکن الحصول بنا دیا گیا۔



باغِ جنّت میں آدم کی نافرمانی کے باعث انسان نے "حیاتِ ابدی" کی صلاحیت کھو دی تھی، جس کے لئے یسوع نے اپنی جان کا کفّارہ ادا کِیا۔ اُس کے مرنے اور دوبارہ جی اُٹھنے سے یہ ممکن ہوا کہ انسانوں کو حیاتِ ابدی دوبارہ حاصل ہو جائے۔ مار سلو کراویری کہتا ہے کہ "اِس لحاظ سے یسوع کو آدمِ ثانی کہنا چاہیئے۔ کیونکہ آدم کے سبب سے حیاتِ ابدی سے محرومی حاصل ہوئی، جبکہ یسوع کے سبب سے حیاتِ ابدی دوبارہ بحال ہو گئی"۔



مسیحیت کے ابتدائی دَور میں یسوع مسیح کا پیغامِ اُمید ہی کافی سمجھا جاتا تھا، اور ابتدائی مسیحی اپنی زندگی کے تمام مسائل کو مذہب کی بنیاد پر ہی حل کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اُن کے لئے یہودی صحائف اور قدیم روایات ہی کافی تھیں، لیکن اُنہوں نے "یہواہ" کے ساتھ یسوع کی ابنیت کو جوڑ کر ایک نیا اِلٰہیاتی نقطہِ نگاہ متعارف کروادِیا، جو یہودیوں کے لئے قابلِ قبول نہ تھا۔ البتہ باقی فلسفہِ کائنات وہی رہا، جو یہودیوں کے نزدیک اجنبی نہ تھا۔



عہد نامہِ جدید میں کہا گیا ہے کہ "ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے، یعنی باپ، جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں اور ہم اُسی کے لئے ہیں، اور ایک ہی خداوند ہے، یعنی یسوع مسیح، جس کے وسیلے سے سب چیزیں موجود ہوئیں اور ہم بھی اُسی کے وسیلے سے ہیں"۔اِس کے علاوہ رفتہ رفتہ کچھ یونانی نظریات بھی اپنا لئے گئے، جن میں "دوسری دنیا" جیسے خیالات کو اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن کسی قسم کے تجربے یا مشاہداتی سائنس کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔



یہی وجہ ہے کہ "مکاں" سے متعلق مسیحیوں کا نظریہ صدیوں تک وہی رہا، جو قدیم عبرانیوں نے مرتب کِیا تھا۔ یہودی خدا کو "مقوم" مانتے تھے اور عہد نامہِ جدید میں کہا گیا ہے کہ "اُسی میں ہم جیتے، چلتے پھرتے اور موجود ہیں"۔ اگرچہ مسیحیوں میں الٰہیاتی بنیادوں پر ارسطو اور افلاطون کی تنقیدیں اور تاویلیں ہوتی رہیں، لیکن "مکاں" کے متعلق کوئی نیا مابعد الطبیعیاتی نظریہ مرتب نہیں ہوا۔



اِن عقائد کی جڑیں کتنی گہری تھیں؟، اِس کا اندازہ نکولس کوزانس کی تصنیفات سے لگایا جا سکتا ہے۔ نکولس (1401ء تا 1464ء) کا شمار پندرھویں صدی عیسوی کے بہت بڑے ریاضی دانوں میں ہوتا ہے۔ تقریباً تیس برس وہ پادری کے عہدے پر رہا اور 1440ء میں اُسے مختلف مسیحی فرقوں کے درمیان الٰہیاتی اتحاد قائم کرنے کا کام سپرد کِیا گیا۔ اُس نے یہ اعتراف کِیا کہ قدرت کے مظاہر کو ریاضیات کی بنیاد پر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔



اپنی تصنیف "عالمانہ جاہلیت" میں اُس نے کہا کہ "عالَم کا کوئی
محیط (گھیرا) نہیں ہے۔ اگر اِس کا کوئی مرکز یا محیط ہوتا تو اِسی
طرح اِس کی ابتدا اور انتہا بھی ہوتی۔ لہٰذا عالَم کسی اور نسبت سے
محدود ہوتا ہے۔ تب عالَم کے پرے کوئی دوسری شئے بھی ہوتی،
مکاں ہوتا۔ لیکن یہ سب ہے نہیں۔ چونکہ عالَم کو ایک مادّی مرکز
اور محیط کے اندر محدود کر دینا ممکن نہیں ہے، لہٰذا ہمارے ذہن
بھی عالَم کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اِس کے معنی تو "خدا کو
سمجھنا" کے ہوں گے، جو عالَم کا مرکز اور محیط ہے"۔



نکولس کوزانس کا یہ فارمولا محض استعارہ نہیں ہے۔اِس کی تشریح میں وہ کہتا ہے کہ "مرکز تو وہ نقطہ ہے، جو محیط کے ہر نقطے سے برابر دُوری پر رہتا ہے۔ مگر کوئی بھی محیط، خواہ وہ زمین ہو یا آسمانی طبق، پوری طرح کُرّوی (یعنی گول) نہیں۔ لہٰذا کسی محیط کا مرکز ہو ہی نہیں سکتا۔اِس کے علاوہ اگر کوئی آدمی آسمان میں کسی مقام پر کھڑا ہو جائے تو اُسے محسوس ہو گا کہ عالَم کا مرکز وہ خود ہے۔ وہی "لامحدود برابری" ہے۔اِس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا ہی عالَم کا مرکز ہے۔ زمین، آسمانی طبقات اور ہر شئے کا مرکز وہی ہے۔ساتھ ہی ساتھ وہ ہر شئے کا لامحدود محیط بھی ہے"۔



نکولس کوزانس کی یہ دلیل ریاضیات کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی۔
حالانکہ اِس میں جیومٹری کی اصطلاحات کا استعمال پوری طرح ہوا ہے۔
یہاں اِس مفروضہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ "خدا کی ذات ہر شئے سے
برابر دُوری پر ہے"۔ اِس کے علاوہ مرکز اور محیط کو ایک مان لینا بقولِ
میکس جیمز، "خالص طبیعیاتی نقطہِ نظر سے سراسر مہمل ہے"۔ پھر بھی
یہ نظریہ سائنسی خیالات اور مسیحی الٰہیات کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا
ہے۔ کیونکہ یہ اُس دور کے خیالات کا نمونہ ہے، جب تمام طبیعیاتی مسائل
کو بھی فلسفہ کی آمیزش کر کے الٰہیاتی بنیادوں پر حل کیا جاتا تھا"۔



سترہویں صدی کے آغاز ہی پر یورپ میں سائنس کی اہمیت بڑھنے لگی۔ مذہبی عقائد کے سلسلے میں بھی پُرانی وضع کی الٰہیاتی دلیلوں سے اب کام نہیں چلتا تھا۔ برطانیہ میں اِسی وجہ سے سائنس کے مطالعہ پر زور دِیا جانے لگا تاکہ "خدا کی صنّاعی کو بہتر طریقے پر سمجھا جاسکے اور خدا کے وجود کا ثبوت سائنسی بنیاد پر حاصل کیا جاسکے"۔ طبیعیات (Physics) کو "فطری فلسفہ" (Natural Philosophy) کی حیثیت سے دینی حلقوں میں بڑی اہمیت دی جانے لگی تھی۔



کیمبرج یونیورسٹی کے ہنری مُور (1614ء تا 1687ء) نے زمان و مکاں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ "مکاں کوئی ذہنی شئے نہیں۔ یہ مطلق ہے اور اِس کا وجود حقیقی ہے۔ لیکن یہ مادّی بھی نہیں۔ اِس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا۔ یہ لا محدود ہے۔ یہی صفات خدا کی بھی ہیں۔ خدا اور مکاں دونوں میں "لازمی وجود" کی صفت ہے۔ مُور نے اِس سے یہ نتیجہ نکالا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ حالانکہ بقول الگزینڈر کوائرے، "یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ "مادّی عالَم خود لا محدود اور ازلی و ابدی ہے"۔



اِس صورت میں خدا کی "تخلیقی سرگرمی" کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور انجامِ کار وجودِ خدا کو ماننے کی بھی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ البتہ مُور کے خیالات نے برطانوی مفکرین پر گہرا اثر ڈالا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ نیوٹن کے سائنسی نظریات کی تہہ میں بھی یہی عقیدے ہیں۔



نیوٹن کے ایک دوست اور رفیقِ کار جوزف ریفسن (1648ء تا 1716ء) نے اپنی ریاضیاتی تصنیف "عمومی مساوات کا تجزیہ اور الجبرائی مساوات کا حل" کے ضمیمہ میں "حقیقی مکاں یا لا محدود ازلی وابدی ہستی" کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مُور کے نظریات کو ریاضیاتی بنیادوں پر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر عالَم مادّے سے بھرا ہوتا تو سیدھی لکیر میں کسی قسم کی حرکت قطعی ممکن نہ ہوتی اور دائرے میں بھی بے انتہا مشکل ہوتی"۔



لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر طرح کی حرکت ہوتی ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سے لازمی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ "خلا" یا "خالی مکاں" کا وجود ہے۔ اِسی وسعت کے اندر اور اِسی وسعت کی وجہ سے حرکت ہوتی ہے۔ یہ وسعت خود غیر مجسم، غیر متحرک، غیر مادّی، لامحدود اور مطلق ہے۔ مادّہ کی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے اور حرکت کر سکتا ہے یا کرتا ہے۔ اِس طور پر مادّہ محدود بھی ہے اور ناقص بھی، کیونکہ اِس کی شکل اور جائے وقوعہ میں تبدیلی آ سکتی ہے۔



اِس کے علاوہ ہر مادّی شئے کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ اِن ٹکڑوں کے درمیان کچھ نہ کچھ فاصلہ ضرور رہے گا، خواہ کتنا ہی کم ہو۔ لہٰذا مادّے کو توسیع شُدہ شئے کہہ سکتے ہیں۔ اگر مکاں نہ ہو، تو نہ توسیع ہو گی اور نہ چیزیں مختلف شکلیں اختیار کر سکیں گی۔ اگر تمام اشیاء کو اِس طرح دبا دِیا جائے کہ اُن کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہ رہے تو عرصہِ عالم مزید تنگ ہو جائے گا۔ لیکن مکاں وہ عظیم وسعت ہے کہ محدود اجسام کا بڑے سے بڑا نظام بھی اِس کے اندر "نہیں" کے برابر ہے۔



اِس کی وسعت وماہیت ذہنِ انسانی میں نہیں آسکتی۔ اِس کے اندر "یہاں"، "وہاں" اور "درمیان" وغیرہ پوری طرح گم ہو جاتے ہیں۔ لامتناہی وجود اپنی نوعیت میں منفرد، واحد اور کاملِ مطلق ہے"۔ مکاں کی خصوصیات کے اِس تجزیے سے ریفسن نے یہ نتیجہ نکالا کہ "ہر وہ شئے، جو مطلق، لامتناہی، لامحدود اور ہمیشہ سے موجود ہو، لازمی طور پر "عِلّتِ اوّل" (First Cause) کے وجود ہی کی نمود ہو گی"۔



ہنری مُور نے تو خدا اور مکاں کی مشترکہ صفات کی فہرست پیش کر کے ہی دونوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن بقولِ الگزینڈر کوائرے، "ریفسن نے ایک طرف تو لا محدودیت کو کاملیت قرار دیا اور دوسری طرف وسعت کو کامل ثابت کیا، جس کی وجہ سے منطقی اور مابعد الطبیعیاتی طور پر یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہو گیا کہ "مکاں خدا کی صفت ہے"۔



زماں کے متعلق بھی مسیحی مذہب کے عقائد اِلٰہیاتی نوعیت کے ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں تو اِس موضوع کے فلسفیانہ یا سائنسی پہلوؤں سے دلچسپی نہیں تھی، پھر بھی یہ سوال پوچھا جاتا تھا کہ آیا "وقت" (time) کے باعث پیدا ہونے والے واقعات کا تانتا کسی خاص سِمت میں لے جاتا ہے یا یہ حادثات کی محض اندھی کڑی ہے؟ عہد نامہِ قدیم کی بنیاد پر یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ "خدا اپنے بندوں، خصوصاً بنی اسرائیل، سے پیار کرتا ہے۔ اُس کی تمام کارسازی اِسی منصوبے کا جزو ہوتی ہے۔ یہ خدائی نظام "زماں" کے وسیلے سے رونما ہوتا ہے۔

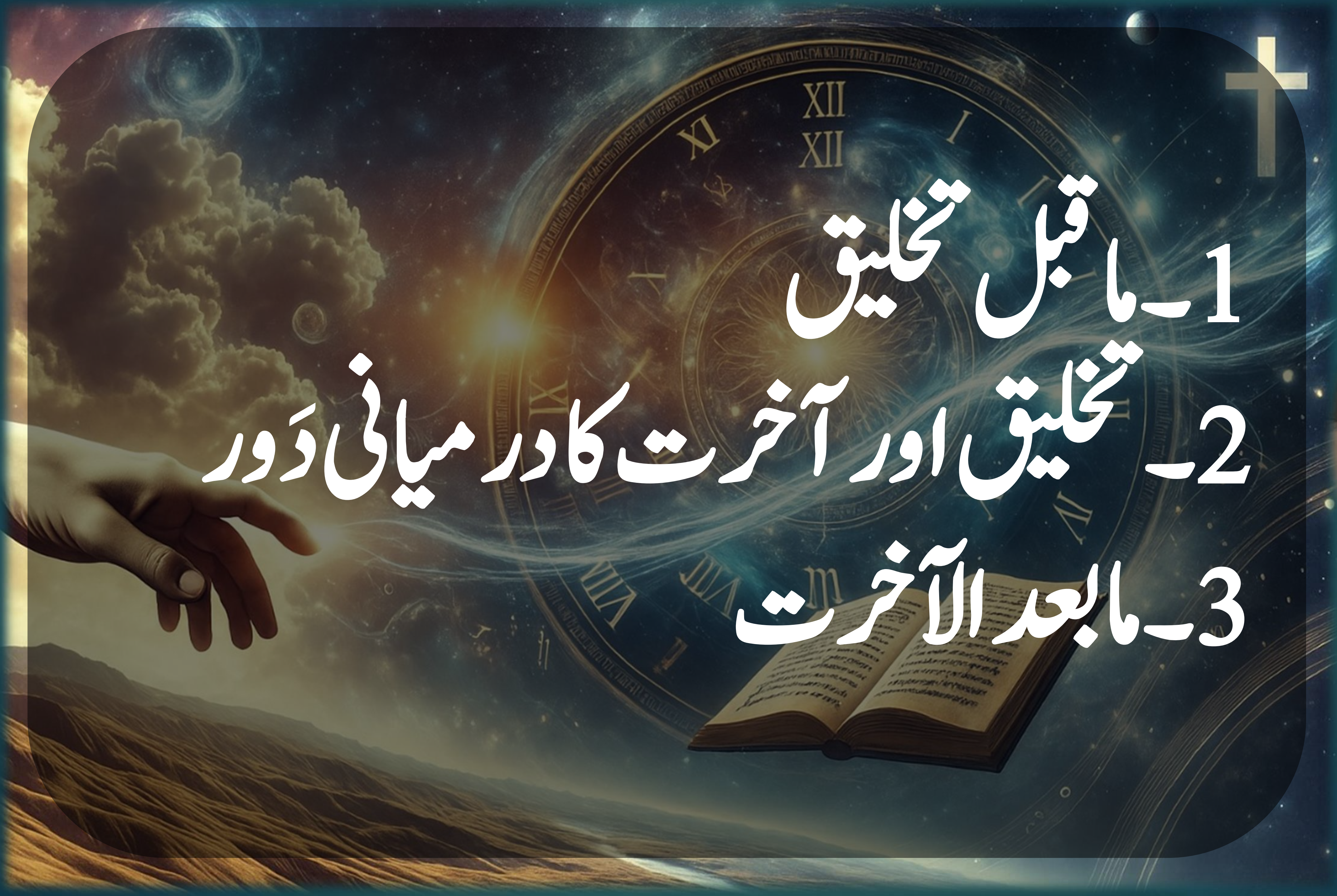


اِسی سلسلے میں مختلف نبی موقع بہ موقع "مسیحا" کی آمد، بنی اسرائیل کی نجات اور یومِ آخرت کی بشارت دیتے رہے۔ عہد نامہِ جدید کا دعویٰ ہے کہ "جب وقت پورا ہوا تو خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا"۔ اگرچہ یہودیوں نے یسوع کو مسیحا اور خدا کا بیٹا نہ مانا، لیکن مسیحیوں کے مطابق یسوع کا مصلوب ہونا، مر کر زندہ ہونا اور آسمان پر اٹھا لیا جانا در حقیقت انبیائے قدیم کی نبوّتوں کی تکمیل ہے۔ یسوع کی مصلوبیت سے ابدی زندگی کا راستہ کھل گیا اور آفاقی تاریخ کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔



عہد نامہِ جدید میں زماں کے متعلق کوئی دقیق تھیوری پیش نہیں کی گئی۔ صرف اِس پر زور دیا گیا ہے کہ خدا اپنی رحمت کو زماں کے وسیلے سے آشکار کرتا ہے اور اِس کام میں یسوع خدا کا شریک ہے۔ انسان کی نجات ایک مسلسل زمانی عمل سے وابستہ ہے، جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک سیدھی لکیر میں پروئے ہوئے ہے۔ اِس لکیر کا رُخ کہیں نہیں بدلتا اور سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ یہودیوں کے مطابق یہ لکیر تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی:




1۔ما قبل تخلیق
2۔ تخلیق اور آخرت کا درمیانی دَور
3۔مابعد الآخرت



عہد نامہِ قدیم میں تخلیق سے پہلے اور آخرت کے بعد والے
دَور کی تصوِیر صاف نہیں ملتی اور "یومِ آخر" بھی مستقبل بعید میں
معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عہد نامہِ جدید میں "زماں" اور "ازل و
ابد" کو ایک ہی مان کر یسوع کی ذات سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔اِس
کا اشارہ اِن الفاظ سے ملتا ہے کہ "اُس (یسوع) کا "وجود" تو
بنائے عالَم سے پیشتر ہی تھا، لیکن "ظہور" اخیر (تخلیقِ عالَم اور
یومِ آخر کے درمیانی) زمانے میں ہوا"۔



یسوع مسیح یومِ آخر کے بعد والے دَور میں "ابد الآباد" ہے، وہی "ابتداء و انتہا" اور "اوّل و آخر" ہے۔ وہی "کل، آج بلکہ ابد تک یکساں" ہے۔ اِس طرح تخلیق سے پہلے والے دَور کی سمجھ بھی آجاتی ہے (حالانکہ تب تک "ازل" کا وجود بھی معلوم نہیں ہوا تھا)، اور آخرت کا نقشہ بھی عملی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اب کسی بھی "مستقبل بعید" کے دَور میں کسی مسیحا کا انتظار نہیں ہے، کیونکہ مسیح تو آچکا ہے۔



یسوع کی صورت میں "مسیح" نے انسانوں کے درمیان کچھ دن گزارے اور مصلوب ہونے کے بعد آج زندہ بھی ہے۔ اُس کی واپسی جلد ہو گی۔ تب ایک ہزار سال تک تمام دنیا پر اُس کی بادشاہت ہو گی۔ اِس کے بعد جُوج ماجُوج سے جنگ ہو گی، جس میں مسیح فاتح ہو گا اور شیطان کو ہمیشہ کے لئے آگ اور گندھک کی جھیل میں ڈالا جائے گا۔ پھر قیامت ہو گی اور مُردے زندہ کئے جائیں گے۔ عدالت کے بعد نیکوں کو یسوع کے ساتھ نئے یروشلیم میں ابدی مُسرّت کی زندگی حاصل ہو گی، جبکہ تمام بدکاروں کو آگ کی جھیل میں ڈال دیا جائے گا۔ اِس طرح موت کا بھی خاتمہ ہو گا اور خدا کا نجات بخش منصوبہ مسیح کے ذریعے پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔



اِن عقائد کی بنیاد پر زمانی سلسلہ کو "نجاتی لکیر" کہا جاتا ہے۔ اِس لکیر کا نقطہ یا "قیروس" خدا کی کارسازی کو ظاہر کرتا ہے اور اِسے صرف یسوع کی زندگی کی بنیاد پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ہر قیروس یا گھڑی آفاقی تاریخ کا ایک اہم لمحہ ہوتی ہے اور کوئی بھی گھڑی دوبارہ نہیں آتی۔ اِس اُٹوٹ مجموعے میں ہر واقعے کے کچھ نہ کچھ معنی ہوتے ہیں اور اِنہی کے ذریعے سے پچھلے واقعات کا آنے والے واقعات سے تعلق اور ربط پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اِن گھڑیوں کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا، کیونکہ خدا خود یہ گھڑیاں متعین کرتا ہے۔ جس طرح اُس نے موسم متعین کئے ہیں۔



اِسی لئے عہد نامہِ جدید میں "جاگتے رہنے" کی تاکید کی گئی ہے۔
کیونکہ "وہ گھڑی" اِس طرح آئے گی، جس طرح چور آتا ہے۔
کچھ قدیم مذاہب اور یونانی فلسفوں میں یہ عقیدہ تھا کہ "زمانہ
دائرے کی شکل میں چلتا رہتا ہے" اور "ایک چکر پورا ہونے پر پھر
وہی نقطے آ جاتے ہیں"۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ماضی سے حال،
حال سے مستقبل اور مستقبل سے دوبارہ ماضی کا سلسلہ ہمیشہ جاری
رہتا ہے۔ لیکن مسیحی عقیدہ کے مطابق "جو کچھ بھی ہوتا ہے، ایک
ہی بار ہوتا ہے اور آفاقی تاریخ دوہرائی نہیں جاتی"۔



یہ عقیدہ منطق کی کسوٹی پر چاہے پورا نہ اُترے لیکن الہٰیاتی طور پر اِس میں کوئی جھول نہیں ہے۔ بقول آسکر کلمن "اگر ہم زماں کے متعلق قدیم مسیحیوں کے عقیدے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو "زماں" اور "ابدیت" کے متعلق تمام فلسفیانہ نظریات سے خود کو پوری طرح آزاد کر لینا چاہیئے"۔ اِس "سطری تھیوری" (Line Theory) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان ایک معنی میں "فانی" اور دوسرے معنی میں "لافانی" ہے۔



فانی تو یوں ہے کہ دنیا میں زندگی کی ایک محدود زمانی مُدّت مقرر ہے، جو پیدائش سے شروع ہو کر موت پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن "عام قیامت" کے بعد انسان کو اعمال کے مطابق "مُسرّت" یا "عذاب" کی "ابدی زندگی" ملتی ہے۔ نجات حاصل کرنے کا موقع صرف ایک ہی بار ملتا ہے۔ اگر یہ موقع کھو دیا جائے تو نتیجے میں ابدی عذاب ملے گا۔



زماں کے سلسلے میں ایک اہم سوال یہ اُٹھتا ہے کہ آیا عالَم کی تخلیق
ہوئی یا نہیں؟ اور اگر ہوئی تو کب اور کتنے عرصے میں؟ اِس معاملے میں
مسیحی مذہب نے یہودیوں کا تخلیقی نظریہ ہی لِیا ہے، جن کا عقیدہ تھا کہ
عالَم کی تخلیق خدا نے کی اور اِس کام میں کُل چھ دِن لگے۔ برمنگھم کے
ایک پادری ارنسٹ بارنس نے کہا کہ "ابتدائی دَور کے مسیحی مذہب کی
جڑیں سیدھے سادے غریب لوگوں میں قائم ہوئیں، جو دانشور نہیں
تھے۔ اُنہیں یہ ماننے میں کوئی تکلّف نہ ہوا کہ عہد نامہِ قدیم مستند تاریخ
ہے، جس میں پہلے دِن سے ہی عالَم کی تاریخ دی گئی ہے"۔



لیکن یہ مذہب جس علاقے میں پھیل رہا تھا، وہاں پہلے ہی سے عقلیات کا اثر موجود تھا۔ اِس کے علاوہ خود مسیحی بھی مختلف فرقوں میں تقسیم ہونے لگے تھے۔ ایک طویل عرصے تک مسیحی علماء میں اِس مسئلے پر بحثیں چلتی رہیں، اور اِس سلسلے میں اب سے کوئی سو برس پہلے تک تقریباً ایک سو چالیس مختلف نظریے ریکارڈ میں آئے، حالانکہ اِس بات میں سبھی متفق تھے کہ عالَم کی تخلیق ہوئی اور کسی مخصوص وقت میں ہوئی۔



تیرہویں صدی کے مسیحی مفکر سینٹ تھامس اکویناس (1226ء تا 1274ء) نے اِس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی اور یہ نتیجہ نکالا کہ "عقلی دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ عالم ہمیشہ سے موجود نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مادّہ کی تخلیق کبھی "زماں" میں ہوئی، اُن پر افسوس ہے۔ حقیقت میں تخلیق تو ایک معجزہ ہے، جسے طبیعی عقلیت کی بنیاد پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ عقیدہ کہ "کائنات کی تخلیق زماں میں ہوئی"، حقیقتاً ایمان کا جزو ہے"۔



تخلیقِ کائنات کی تفصیلی تشریح کرتے ہوئے اُس نے بتایا کہ
"خدا نے تین دن تو چھانٹنے میں لگائے اور تین دن سنوارنے
میں۔ پہلے دن اُس نے اندھیرے کو اُجالے سے الگ کِیا،
دوسرے دن اوپر آسمان کے پانی کو نیچے زمین کے پانی سے جُدا کِیا،
تیسرے دن خشکی کو تَری سے الگ کرنے کے بعد نامیاتی کو غیر
نامیاتی سے جُدا کِیا، اِس طرح نباتات کی نمود ہوئی۔ چوتھے دن
آرائش کا کام شروع ہوا"۔



"سب سے پہلے چاند، سورج اور ستارے بنائے گئے۔ پانچویں دن مچھلیوں اور پرندوں کے وجود سے کائنات کو رونق بخشی۔ چھٹے دن ہر طرح کے جانور پیدا کرنے کے بعد خدا نے اشرف المخلوقات، یعنی "انسان" کو اپنی شبیہ پر تخلیق کیا۔ یہ اُس کی تخلیق کی تکمیل تھی"۔



یہاں "دِن" سے کیا مراد ہے؟ اِس پر بڑی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ایک تاویل تو یہ کی گئی کہ "دِن" کا مطلب چوبیس گھنٹے نہیں بلکہ "ایک ہزار شمسی سال" ہے۔ زبور میں کہا گیا ہے کہ "تیری نظر میں ایک ہزار برس ایسے ہیں، جیسے کل کا دن، جو گزر گیا اور رات کا ایک پہر"۔ پہلی بات عہد نامہِ جدید میں بھی دہرائی گئی ہے کہ "خداوند کے نزدیک ایک دن ہزار برس کے برابر ہے"۔



اِسی تاویل کی بنیاد پر کائنات کی عمر کا حساب لگایا گیا اور اندازہ ہوا کہ کائنات کی عمر چھ سات ہزار سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ لیکن جب انیسویں صدی عیسوی میں چارلس لیل کی کتاب "اصولِ ارضیات" شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ "دنیا کم از کم پانچ ارب سال سے ہے اور انسان کو موجودہ شکل اختیار کئے ہوئے کئی لاکھ سال گزر چکے ہیں"۔ اِس پر مسیحی علماء نے اپنی تاویل میں یہ کہہ کر اصلاح کر لی کہ "دن سے مراد صرف "ایک ہزار برس" ہی نہیں بلکہ اِس سے مراد "ارضیاتی دَور" ہے، جس کی مُدّت کئی کئی کروڑ برس ہوتی ہے"۔



"تخلیق کسی مخصوص لمحے میں نہیں ہوئی۔ یہ تو خدا کا عمل ہے،
جس کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ عالَم کا موجود ہونا ہی اِس بات کا
ثبوت ہے کہ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ لیکن ایک نہ ایک دن
خدا اِس کا خاتمہ کر دے گا"۔



1877ء میں کینیڈا کے ایک عالِم جے ڈبلیو ڈاؤسن نے ارضیاتی تھیوری اور مسیحی عقائد کا موازنہ کرکے یہ دکھایا کہ "دونوں میں الفاظ اور اصطلاحات کا فرق ضرور ہے، لیکن بات ایک ہی کہی گئی ہے"۔ زماں کی اِس "سطری تھیوری" کی بنیاد پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ "زماں کا خاتمہ کب ہو گا؟" یسوع کے شاگرد تو یہ سمجھتے تھے کہ "یومِ آخرت" اُن کی اپنی ہی زندگی میں آجائے گا۔



تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں جولیس افریکانوس نے حساب لگایا کہ "آدم کی پیدائش 5499 قبل مسیح میں ہوئی۔ اِس طرح یسوع کی آمد پر تخلیق کے ساڑھے پانچ دن گزر چکے ہیں اور چھٹا دِن 500ء میں پورا ہو گا۔ تب یسوع کی واپسی اور ایک ہزار برس کی حکومت کے بعد دنیا ختم ہو جائے گی"۔ اِسی طرح کچھ اَور تاریخیں بھی متعین کی گئیں اور گزر گئیں۔ لوگ یہی اُمید کرتے رہے کہ مسیح کی بادشاہی جلد آنے والی ہے۔



ازمنہِ وسطیٰ میں مسیحی مبلّغین اِس نعرہ پر لوگوں کو جمع کر لیتے
تھے کہ "زمان کا خاتمہ قریب ہے اور اہلِ ایمان اور مظلوم عوام
کے لئے جلد ہی مکمل انصاف کا نظام قائم ہو گا"۔ ا سٹیفن ٹالمن
اور جون کِڈ فلیڈ کا خیال ہے کہ "اِسی اُمید کے ساتھ صلیبی جنگوں
میں مسیحی عوام کا جوش نا قابلِ بیان تھا"۔ ہزاروں انسان، جو ارضِ
مقدس کی طرف موج در موج کوچ کرتے جا رہے تھے، یہی
سمجھتے تھے کہ "مسلمانوں" کے خلاف جنگ یسوع مسیح کی واپسی کا
پیش خیمہ ہے۔



اُن میں کثیر تعداد بے زمین کسانوں اور بے روزگار شہریوں کی شامل تھی۔ اُن کے پھٹے پرانے کپڑوں سے پریسٹوں اور حکمرانوں کو بڑی کراہیت ہوتی تھی۔ وہ اُن کو جہاد میں شریک ہونے سے روک تو نہیں سکتے تھے، لیکن اُن سے نفرت ضرور کرتے تھے۔ پریسٹوں اور حاکموں کو اُن کی عوامی تحریکوں سے زبردست خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے اِن بے شعور مؤمنوں کو صلیبی جہاد کی طرف لگا دیا۔



اِسی طرح جب سولہویں صدی عیسوی میں مارٹن لوتھر نے مذہبی اصلاح کی تحریک چھیڑی تو اُس نے یہ حساب لگایا کہ دنیا کی تخلیق 4000 قبل مسیح میں ہوئی اور اِس کی کُل عمر چھ دن کی ہے۔ لہٰذا 2000ء میں اِس کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ لیکن چونکہ بدکاری اور اخلاقی گراوٹ حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے، تو خدا اِتنا عرصہ انتظار نہیں کرے گا"۔



بعد ازاں جوہان کیپلر (1571ء تا 1630ء) نے سورج
گرہنوں کا حساب جوڑ کر کہا کہ "یسوع کی پیدائش میں چار سال کا
فرق ہے"۔ اِسی بنیاد پر آئرلینڈ کے آرچ بشپ آشر نے یہ نتیجہ
نکالا کہ "دنیا 4004 قبل مسیح میں اتوار کے روز 23 اکتوبر
ساڑھے نو بجے رات کو وجود میں آئی۔ اِس حساب سے "یوم
آخر" کی ابتدا 23 اکتوبر 1996ء کو ساڑھے نو بجے رات سے پہلے
ہی ہو جائے گی"۔ بشپ آشر کی تاریخ کو برطانوی اینگلیکن فرقے
میں مستند مان لیا گیا۔



کچھ دیگر فرقوں کو امید تھی کہ دنیا 1968ء ہی میں ختم ہو جائے گی۔ یہواہ کے گواہ (Jehovah's Witness) لوگوں کو آگاہ کرتے رہے کہ "اگر 1975ء میں دنیا مکمل طور پر تباہ نہ بھی ہوئی تو اِس کی تباہی کا کچھ نہ کچھ سلسلہ ضرور شروع ہو جائے گا"۔ لیکن فرانسیسی عالِم فلیمیرین نے آج سے سو برس پیشتر کہا تھا کہ "اِس طرح کی قیاس آرائیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلکیات کے صحت مند مطالعے کی طرف سے دھیان ہٹ جائے۔ اِس سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ اگر سائنس ایسے سوالوں کی طرف توجہ دے تو شاید خود بھٹک جائے گی"۔



زماں کی ابتدا اور انتہا کے متعلق اِن عقائد کی تہہ میں یہ سوال تھا کہ "بنی نوع انسان کو نجات کیسے حاصل ہو گی؟" اِن عقائد سے الٰہیاتی ضرورتیں تو پوری ہو جاتی تھیں، لیکن اِن میں "نظری" قیاس آرائیوں کو کوئی خاص توجہ نہ دی جاتی تھی۔ پھر بھی مسیحی علماء کو فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے سینٹ آگسٹائن (354ء) نے فلسفہ، مابعد الطبیعیات اور عام تجربہ میں آنے والی باتوں کی آمیزش کر کے الٰہیاتی مسئلوں کو سمجھانے اور صحیح ثابت کرنے کی بنا ڈالی۔



آگسٹائن شمالی افریقہ میں پیدا ہوا اور ابتدا میں "مانی ازم" کا پیروکار تھا۔ یہ مذہب ایران سے نکلا تھا، جس میں "عالَم" کی تشریح عقلی بنیادوں پر کی جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ آگسٹائن مسیحیت کی طرف مائل ہو گیا اور بعد ازاں کلیسیاء میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوا۔ ازمنہِ وسطیٰ اور دورِ اصلاح میں اُس کی تعلیم سے رومن کاتھولک اور پروٹسنٹ دونوں فرقوں نے استفادہ کِیا۔ آگسٹائن نے مسیحی الٰہیات پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیئے۔ اُس کا مشہور مقولہ ہے کہ "پہلے مانو، پھر سمجھو"۔ وہ ہر مسئلے کو کتابِ مقدس سے شروع کرتا تھا۔



آگسٹائن کے ہم عصروں نے اُس سے پوچھا کہ "آسمان اور زمین بنانے سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا؟" اُس نے جواب دیا: "میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ وہ تجسّس کرنے والوں کے لئے جہنم تیار کر رہا تھا، لیکن تمہارا سوال ہی مہمل ہے"۔ کتابِ مقدس کی بنیاد پر وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ "کوئی نہ کوئی پہلا لمحہ ضرور تھا۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیں کہ ایسا کوئی لمحہ نہ تھا، تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ زماں خدا کی طرح ازلی و ابدی ہے۔ جس طرح خدا نے آسمان و زمین کو خلق کِیا، اُسی طرح زماں کو بھی خدا نے تخلیق کِیا ہے"۔



آگسٹائن کے مطابق "زماں بھی مخلوق ہے اور "مشیّتِ الٰہی" سے
پیدا ہوا۔ لہٰذا کارِ تخلیق کی ابتدا سے پہلے زماں کے وجود کو ماننا غلط ہے۔
اِس کے علاوہ زماں میں ماضی، حال اور مستقبل بھی ہوتا ہے، لیکن خدا
"حاضرِ مطلق" ہے، جس کے لئے نہ ماضی ہے، نہ مستقبل ہے۔ پھر خدا
کا زماں سے پہلے "ہونے" یا "نہ ہونے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔



آگسٹائن زماں سے متعلق یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ "وہ روح کی سرگرمی ہے، جس کے وسیلے سے انسان "حرکت کی مقدار" کو ناپ سکتا ہے۔اِس سرگرمی کے تین پہلو ہیں: 1۔ برداشت 2۔ دھیان اور 3۔ پیش بندی۔ یعنی آدمی بات کرتے وقت پیش بندی کرتا ہے کہ "کیا کہنے والا ہے" اور اِس پر دھیان رکھتا ہے کہ "کیا کہہ رہا ہے"، اور یاد رکھتا ہے کہ "کیا کہہ چکا ہے"۔ جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو آدمی کے دماغ میں اُس کی تصویر بنتی ہے اور بعد میں یہ تصویر الفاظ میں بدل جاتی ہے"۔





"جب تک آدمی کا دماغ موجود ہے، تصویر اور الفاظ بھی روحِ انسانی میں محفوظ ہیں۔ جب انسان ماضی کو یاد کرتا ہے تو متعلقہ تصویر کو "ذہن کی آنکھ" سے دیکھ لیتا ہے، حالانکہ اصل واقعہ کا وجود باقی نہیں رہتا۔ پھر جب انسان ماضی کے واقعات کو بیان کرتا ہے تو وہ حقیقتاً واقعات کو نہیں بلکہ محض اُن الفاظ کو پیش کرتا ہے، جو متعلقہ تصویروں سے نکلے ہیں اور ذہن میں ہمیشہ کے لئے موجود ہیں"۔

ارسطو کے خیال میں "ماضی اور مستقبل کا وجود نہیں ہے"، لیکن
آگسٹائن مانتا ہے کہ "ماضی اور مستقبل "انسانی روح کے اندر"
گزرے ہوئے واقعات کی "یاد" اور آنے والے واقعات کی "پیش
بندی" کی حیثیت سے اُسی طرح موجود ہیں، جس طرح حال گزرتے
ہوئے واقعات پر "دھیان" کی شکل میں موجود ہے۔ اِس طرح
ماضی، حال اور مستقبل کو بالترتیب (1) گزرے ہوئے واقعات سے
منسوب حال، (2) گزرتے ہوئے واقعات سے منسوب حال، اور
(3) آنے والے واقعات سے منسوب حال سمجھنا چاہئے۔



اگرچہ اِس سے حال کی توسیع نہیں ہوتی، لیکن روح کی توجہ برقرار رہتی ہے اور یہی توجہ مستقبل کے لئے ماضی میں چلے جانے کا راستہ فراہم کرتی ہے۔ روح کو تین سرگرمیوں یعنی (پیش بندی، دھیان اور یاد داشت) کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اِس لئے وہ حرکت کے بہاؤ میں خود تھوڑا بہت شریک ہو جاتی ہے۔ اِس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا احساس، حرکت اور اِس کی ناپ (جسے ہم زماں کہتے ہیں) خود بہاؤ میں ہے۔



عام طور پر چاند اور سورج کی گردش سے ہی وقت کا حساب لگایا جاتا ہے، لیکن آگسٹائن کے خیال میں زماں کی پیمائش اجرامِ فلکی کی حرکت پر منحصر نہیں ہے۔ مثلاً اگر سورج کی چال دھیمی یا تیز ہو جائے تب بھی ایک پورے چکر کا زمانی عرصہ دن رات ہی کہلائے گا۔ حالانکہ یہ عرصے برابر نہیں ہوں گے۔ حرکت تو خود زماں کے وسیلے سے ناپی جاتی ہے۔ لیکن زماں کو کس پیمانے سے ناپا جائے؟ مکانی وسعت کو تو چھوٹی مکانی وسعت سے ناپا جا سکتا ہے، جیسے ہاتھ کی لمبائی سے دیوار کی اونچائی کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن زماں کے لئے کوئی ایسا پیمانہ نظر نہیں آتا۔



مثال کے طور پر "آواز" بھی حرکت ہے۔ جب تک آواز نکل رہی ہو، تب تک اُس کی صحیح ناپ نہیں ہو سکتی اور بند ہو جانے کے بعد تو اُس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر بھی آواز کے طُول کو ناپ لیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ کچھ زمانی وقفے دماغ کے اندر موجود ہیں اور انسانی دماغ اِنہی سے آواز کو ناپ لیتا ہے"۔ چنانچہ آگسٹائن نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ "روح کی سرگرمی ہی ایک مطلق پیمانہ ہے، جو خود مختار اور حرکت کے قوانین سے آزاد ہے۔ اس طرح زماں کو روح کا "مضاف" یا "پھیلاؤ" سمجھا جا سکتا ہے۔



اِس نظریے کا الٰہیاتی مطلب یہ ہوا کہ زندگی ایک مسلسل توسیع یا پھیلاؤ ہے۔ کیونکہ عالم میں تبدیلی اور تواتر کی بنیاد زماں ہی ہے۔ روح کو جن باتوں کا علم ہوتا ہے، وہ زمانی تسلسل سے ہی ہوتا ہے اور روح کے اندر خود اِس دنیا میں رہنے کی وجہ سے پھیلاؤ یا انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ لٰہذا انسان کو چاہئے کہ اِس "پھیلاؤ" سے الگ ہو کر خود کو بلند سطح پر اٹھانے کی کوشش کرے اور فیضِ خداوندی سے لَو لگائے۔



آگسٹائن نے الٰہیاتی عقائد کی فلسفیانہ تاویل کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اُسے تیرہویں صدی میں تھامس اکویناس نے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ مسیحی مذہب میں اُس کی وہی حیثیت ہے، جو اسلام میں امام غزالی کی ہے۔ عقائد کے سلسلے میں وہ اکابر کے اقوال کو کافی نہیں سمجھتا۔ اُس کا کہنا تھا کہ "دلیلِ نقلی سب سے کمزور دلیل ہے۔ اکابر نے جو بات درست کہی ہے، اُس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور جو غلط کہا ہے، اُسے رد کر دینا چاہئے۔ فلسفے کا مقصد یہ جاننا نہیں کہ لوگ کیا سوچتے ہیں؟ بلکہ یہ ہے کہ سچائی کیا ہے؟"



اکویناس نے اِسی اصول کی بنیاد پر اپنی تصانیف میں مسیحی عقائد کی تشریحات پیش کی ہیں خصوصاً "Suma Theologia" میں۔ زماں سے متعلق اُس نے یونانی فلسفیوں کے نظریات کو صحیح نہیں مانا اور وہ اِس بنیادی عقیدہ پر رہا کہ "زماں کا خاتمہ ضرور ہو گا"۔ اجرامِ فلکی کی دائرہ وار حرکت چاہے کتنی ہی کامل کیوں نہ ہو، اُن کی گردش کا اصل سبب یہ ہے کہ خدا نے اُن کو منصوبہ کے تحت گردش میں ڈال دیا ہے۔ جیسے ہی یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچے گا، خدا اُن کی حرکت کو بند کر دے گا۔



تھامس اکویناس اور آگسٹائن کی تعلیمات آج بھی رومن کاتھولک فرقہ کی رہنمائی کرتی ہیں۔ دوسرے مسیحی فرقے بھی اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب بھی سائنس اور الٰہیات کو ملانے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اُن دونوں کے طرزِ استدلال کو اپنایا جاتا ہے۔ اکویناس کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ (1) مذہبی عقائد کو بنیادی طور پر صحیح مانو، (2) عام تجربے میں آنے والی باتوں سے اِن عقائد کے صحیح ہونے کا ثبوت تلاش کرو، (3) قدیم فلسفیوں اور عالِموں کا مقولہ بھی سند میں پیش کرو، جب وہ تجربے کی کسوٹی پر پورا اتر چکا ہو۔



یہ طرزِ استدلال اہلِ ایمان کو اَور بھی پختہ کرنے کے لئے کافی ہے، اور اگر کوئی شک اور یقین کے چکر میں پھنسا ہو تو اُس کے شکوک و شبہات بھی اِس طرح کی دلیلوں سے دور ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بنیادی مفروضوں کو سِرے سے ہی ماننے کے لئے تیار نہ ہو تو اُسے آگسٹائن یا اکویناس کی منطق سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔




ختم شُد

